قرآن کریم کی زبان۔ابن ورّاق کی آرا کے تناظر میں

حفصہ نسرین*

قرآن کریم کی زبان ہونے کے سبب عربی زبان، اس کی تاریخ، اس کی فصحیٰ عامیہ سبھی مستشرقین اور استشراق زدہ ذہنوں کے حاملین کے لیے باعث تشکیک اور خاص ہدفِ بحث رہی ہیں۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ نے اپنی اپنی دانست اور افتادِطبع کے مطابق اپنی اپنی کتب و مقالات میں اس موضوع پر خامہ فرسائی کی اور عربی زبان کی تاریخ، اس کے ارتقا وغیرہ کومشکوک ثابت کرنے کی سعی و کاوش کی۔عصر حاضر میں مستشرقین کے ساتھ ساتھ ان کے بعض جانشین، جوخود لادین ہیں،لیکن یہود و نصاریٰ کی نیابت کے فریضے کوانجام دے رہے ہیں ان کے نظریات اور ان کی نام نہاد،مبنی برتعصّب وعنادتحقیقات کےمن چاہےنتائج کے پرچار میں کوشاں ہیں۔ان کی کتب و مقالات کی تدوین نوکر کے شائع کررہے ہیں۔ اسی طبقے کا ایک نمایاں نام ابن ورّاق کا ہے۔ ابن ورّاق [قلمی نام راج کوٹ ہندوستان کے ایک مسلم گھرانے میں جنم لینے والا حالاً دہریہ ہے جوقرآن کریم پر مستشرقین کی تقریباً تمام اہم کتب و مقالات کو ازسرنو مدّون کرکے شائع کررہا ہے۔ نیز انہی استشراقی تحقیقات پر تکیہ کرتے ہوئے خودبھی مقالات وغیرہ لکھ کر رسائل و جرائد میں شائع کرانے میں مصروفِ عمل ہے۔ اس نے قرآن کریم پر متعدد مقالات و کتب تصنیف کیں۔ اپنی ایک کتاب What the Koran Really Says کے طویل مقدمے میں اس نے تاریخ عربی زبان اور لغت قرآن پر طویل بحثیں کی ہیں۔ جن کا ماحصل بزعم ورّاق یہ ہے کہ عرب معاشرے میں متنوع قبائل لہجات رائج رہے۔ کوئی مشترکہ ادبی زبان رائج و متداول نہیں تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی اس کے برعکس عرب معاشرے میں Diglossia تھا۔ چھٹی صدی عیسوی میں فصحیٰ نامی کوئی چیز جزیرہ عرب میں نہیں پائی جاتی تھی چنانچہ جاہلی شاعری کا سارا مجموعہ من گھڑت ہے اور اس کا لابدی وحتمی نتیجہ یہ تھا کہ قرآن کریم کی زبان کوئی مشترکہ ادبی زبان نہیں تھی۔ بلکہ یہ بھی سمجھا نہیں جاسکتا کہ آخر وہ کس کی زبان میں تھا۔ نیز مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ قرآن لغتِ قریش میں نازل ہوا، بالکل بے بنیاد ہے۔

مقالہ ہٰذا میں ورّاق کے اُٹھائے ہوئے مندرجہ بالا نکات پر بحث کی جائے گی۔ مقالہ ابتدائیے، دو اجزاء اور اختتامیے پر مشتمل ہے۔

حصہ اوّل میں درج ذیل نکات زیر بحث آئیں گے:

---

* اسسٹنٹ پروفیسر/ مدیر، شعبہ اردو دائرہ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، پاکستان۔

ا- عرب معاشرے میں Diglossia تھا یا نہیں اور کیا یہ صرف عرب معاشرے کا تخصص تھا؟
ب- چھٹی صدی عیسوی میں فصحیٰ عربی زبان کی صورت حال
ج- قواعد فصحیٰ کی تدوین
د- جاہلی شاعری کا پایہ استناد

جب کہ جزوِ ثانی میں قرآن کریم میں وارد مختلف قبائل لہجات کا ایک اجمالی تذکرہ ہوگا۔

(ا) عرب معاشرے میں کسی قسم کا Diglossia تھا یا نہیں اور کیا وہ صرف جزیرہ عرب ہی کا خاصّہ تھا؟

ابن ورّاق کے مطابق جزیرہ عرب میں ایک طرف تو عامیّہ رائج تھی یعنی مختلف قبائل کے اپنے اپنے لہجات تھے جبکہ دوسری طرف ایک اعلیٰ ادبی شستہ زبان کے رائج ہونے کا دعویٰ بھی کیا جاتا ہے۔ اسے وہ digglosia یعنی "a break between the spoken and written language" قرار دیتا ہے۔ اس کے مطابق ایسے معاشرے میں کوئی linguistic norm نہیں ہوسکتا(۱)۔

فی الحقیقت diglossia فصحیٰ اور عامیہ کے مابین کسی break کا نام نہیں ہے۔ اس کے لغوی معنی دو شگافہ زبان کے ہیں(۲)۔ اس سے مراد ایک ایسی صورت حال ہے جس میں ایک ہی زبان دو صورتوں میں معاشرے میں رائج و مستعمل ہوتی ہے۔ ایک کو فصحیٰ یعنی "literary or prestigious dialect" کہا جاتا ہے دوسری کو عامیہ یعنی "a common dialect spoken by most of the population"(3)۔ دونوں کے استعمال کے مواقع مختلف ہیں۔ فصحیٰ بالعموم "High" یعنی اعلیٰ زبان اور عامیہ "Low" کہلاتی ہے۔ ایک مغربی محقق ان کے استعمال کے مواقع یوں بیان کرتا ہے:

> "H [High] is used in such contexts as Sermons, lectures, speeches, news broadcasts, and newspaper editorials and learned in school. L [Low] is used in everyday conversations, radio soaps, folk literature and other in formal contexts.(4)

تاریخ السنۂ عالم کی مسلّمہ شہادتوں کی روشنی میں بڑے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ صورت حال قریباً سبھی اہم اور زندہ زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ ہر زبان میں فصحیٰ یعنی اعلیٰ ادبی زبان بھی ہوتی ہے اور عامیہ یا علاقائی لہجات، روزمرہ کی زبان۔ معیاری ادب ہمیشہ فصحیٰ ہی میں تخلیق ہوا کرتا ہے(۵)۔ ایسا ہی جزیرہ عرب میں بھی ہوا تو اس میں کسی حیرت و استعجاب اور غیر معتبر و مستند تحقیق کے بعد تکذیب و انکار! چہ معنی دارد؟

یہ دعویٰ ہی عجیب وغریب ہے کہ چونکہ وہاں diglossia تھا اس لیے قرآن کی زبان مشکوک ہے۔ بلکہ ابن ورّاق digglosia کو تسلیم کرکے جزیرہ عرب میں ایک ادبی زبان کے وجود کو بھی تسلیم کررہا ہے اور linguistic norm کو بھی۔

(ب) چھٹی صدی عیسوی میں جزیرہ عرب میں کلاسیکل عربی زبان فصحیٰ کی صورتِ حال

ابن ورّاق کے مطابق چھٹی صدی عیسوی میں جزیرۂ عرب میں ایسی کوئی معیاری ادبی زبان (linguistic norm) جسے کلاسیکل عربی یا فصحیٰ کہا جاسکے، موجود نہیں تھی۔ نیز جزیرے میں فنِ کتابت کی عدم موجودگی کے باعث مشترکہ زبان کی تشکیل ناممکن تھی۔ مختلف قبائل کے اپنے اپنے لہجات تھے اور ان کے مابین اتنا تفاوت تھا کہ بسااوقات مختلف قبائل کے لوگ ایک دوسرے کی بات کو نہ سمجھ پاتے تھے(۶)۔ سطور زیریں میں اسلامی ومغربی مصادر کی روشنی میں ابن ورّاق کے اس دعوے کا تجزیہ پیش کیا جارہا ہے:

> تمام السنۂ عالم میں علاقوں، پیشوں، مختلف معاشرتی طبقات وغیرہ کی بنا پر لہجات مختلفہ پائے جاتے ہیں۔ اس کے پہلو بہ پہلو ہر ملک، ہر خطّے میں ایک مشترکہ ادبی معیاری زبان ہوا کرتی ہے۔ یہ شعرو ادب کی زبان کہلاتی ہے اور اس میں ادب تخلیق ہوا کرتا ہے۔ مثلاً ہندوستان میں ازمنۂ قدیم سے متنوّع علاقائی زبانیں مستعمل رہی ہیں لیکن پورے ملک کی ادبی زبان کا درجہ سنسکرت کو حاصل رہا ہے یہی مذہب کی زبان یعنی ویدوں کی زبان ہے(۷) اور برہمنوں کی بھی(۸)۔ تانبے کے عہد کے چینی کتبات لہجات مختلفہ اور ایک معیاری ادبی زبان کے وجود کی شہادت دیتے ہیں(۹)۔ اسی طرح قبطی زبان بڑے لہجاتی اور پھر ذیلی گروہوں میں منقسم تھی لیکن اس کی فصحیٰ کا درجہ بوہری نامی لہجے کو حاصل تھا(۱۰)۔ اس طرح یونانی اور دنیا کی بہت سی زبانیں۔ بعینہٖ یہی معاملہ عربی زبان کے ساتھ تھا۔ جزیرہ عرب میں بہت سے لہجات تھے لیکن ایک فصحیٰ بھی تھی جو شعروادب کی زبان تھی۔

دنیا کی ہر اہم تہذیب ایک انفرادیت، ایک تخصص کی حامل رہی ہے مثلاً یونانیوں کی شان وشوکت ان کے فلسفے اور فن مجسمہ گری میں جھلکتی ہے تو چینیوں کی ریشم اور دیگر بیش قیمت پارچہ جات میں، اسی طرح عربوں کی شان شکوہ کی عکّاس ان کی سحر انگیز اثر آفرین، انتہائی وسیع و جاذب، حلاوت کی حامل زبان ہے(11)۔ پروفیسر Hitti کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے:

> If the glory of Indo-European Greeks in their buildings and sculptures, Hebrew's in psalter, then splendour of Arabs shine in their magestic language, their ode.(12)

جزیرہ عرب میں فصاحت و بلاغت ہی کو انسان کا وصف خاص گردانا جاتا تھا۔ زبان دانی قدرت وندرت بیان ہی اعلیٰ محاسن میں شمار ہوتی تھی(۱۳)۔ بنابریں Hittie یہ تبصرہ کرتا ہے کہ الفاظ کا اعجاز وفسوں کاری جس طرح عربوں کے ہاں انسانی جذبات واحساسات میں ارتعاش پیدا کرتی ہے، وہ عدیم النظیر اور فقید المثال ہے(۱۴)۔ عرب اپنی زباندانی پر اس حد تک نازاں تھے کہ اپنے علاوہ سب کو عجمی (گونگا) کہا کرتے تھے۔ اسی زبان دانی کے مظاہرے کے لیے کم سے کم الفاظ میں زیادہ معانی کے دلنشین واضح انداز میں، صوتی اثرات کے حسن و جمال اور معنویت کے بحر بیکراں میں ڈھال کر پیش کرنے کے لیے عربوں کے ہاں متعدد اصنافِ سخن رائج تھیں مثلاً منافرۃ و مفاخرہ(۱۵)، قصص و ایّام عرب(۱۶)، خطابۃ(۱۷)، امثلہ وحکم(۱۸)، کہانت(۱۹)، وصایا(۲۰)، مسامرہ(۲۱)، و شاعری وغیرہ۔ چنانچہ اپنی شعلہ بیانی اور قادرالکلامی کے اظہار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی بھرپور سعی و کاوش کی جاتی۔ اگرچہ دونوں ہی اصناف ادب یعنی شعر و نثر عربوں کے ہاں معروف و متداول تھیں لیکن شعر و شاعری کو ایک خاص مقام و مرتبہ حاصل تھا(۲۲)۔ شاعری عربوں کا دیوان کہلاتی ہے(۲۳)۔ عرب فنون لطیفہ میں اسے ہمیشہ اولین وممتاز ترین مقام حاصل رہا۔ چنانچہ عہدِ جاہلی میں نغمۂ ہائے مسرت، نوحہ ہائے غم، اسلاف کے کارنامے بیان کرنے، اپنے قبیلے کو جنگ کے لیے بھڑکانے یا پھر ایسی ہی کسی بھڑکتی ہوئی آگ کو بجھانے، کسی کی مدح خوانی یا پھر تنقیص و ہجو سبھی مقاصد کے لیے شعر کو وسیلہ و ذریعہ بنایا جاتا تھا(۲۴)۔ بنابریں اعلیٰ ترین اشعار کہنا اور سامعین کے سامنے پیش کر کے داد وتحسین وصول کرنا عربوں کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ اس مقصد کے لیے متعدد مقامات و مواقع تھے۔ مثلاً اسواق العرب(۲۵)، جہاں اطراف واکنافِ عرب کے لوگ جمع ہوتے تھے، ایک طرف تو تجارت ہوتی تھی اور دوسری طرف یہ بازار ادبی سرگرمیوں کا بھرپور مرکز تھے۔ مثلاً عکاظ(۲۶)، ذوالمجنّہ(۲۷)، مجاز(۲۸)، وغیرہ شعراء اپنا کلام ان سالانہ میلوں میں سنایا کرتے تھے اور جس کا کلام سب سے اعلیٰ قرار پاتا اسے لکھوا کر دیوار کعبہ پر آویزاں کر دیا جاتا تھا۔ اس نوع کا مشہور ومقبول ترین کلام معلقات سبعہ ہیں(۲۹)، ایسی شاعری کے خالق شعراء کو بھی بہت عزت واحترام اور القابات وخطاب ملتے تھے۔ ان میلوں ٹھیلوں کے علاوہ عربوں کے ہاں بیٹھکیں ہوا کرتی تھیں جو عام سماجی مسائل پر غور وخوض کے علاوہ ادبی نشستیں بھی ہوتی تھیں۔ ان میں مشہور ترین ''نادی قریش'' اور ''دارالندوہ'' تھیں(۲۹) جو کعبہ شریف کے سامنے واقع تھیں جہاں روزمرّہ کے مسائل اور معاملات پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ بادیوں میں بھی ان مجالس اور بیٹھکوں کا رواج تھا، جہاں لوگ اپنے مسائل پر غور وخوض کرنے کے علاوہ شعر وشاعری اور حسب نسب پر مفاخرہ کیا کرتے تھے۔ چنانچہ سبھی کوشاں رہتے کہ وہ شیریں ترین الفاظ، انوکھے اور دلکش ترین اسالیب اختیار کریں تاکہ عرب کے ہر کونے، ہر گوشے میں قادرالکلام شاعر، خطیب، افصح ترین

شخص کے طور پر انھیں کے نام کی بازگشت سنائی دے۔ جزیرہ عرب میں زبان و بیان کی اہمیت کے مسلمہ تاریخی شواہد کے تناظر میں کیا ایک عالم ومحقق کا یہ دعویٰ معقول ہوگا کہ وہاں کسی مشترکہ ادبی لسان کا کوئی وجود نہ تھا!

اسواق العرب میں عرب کے لوگ جمع ہوا کرتے تھے۔ زبان و بیان کے مُعجزنمونے سنتے اور سر دھنتے تھے۔ لہٰذا یہ امر لابُدّی تھا کہ وہاں وقوع پذیر ہونے والی سبھی ادبی سرگرمیاں کسی ایسی زبان میں ہوتی تھیں جو ایک طرف تو ان سب کو، باوجود لہجاتی تفاوت کے، سمجھ میں آتی تھی اور دوسری طرف یہ افصح اور معیاری ٹکسالی زبان تھی جس میں نظم کیا گیا قصیدہ دیوار کعبہ پر معلق ہوتا۔ عمرہ کے لیے آنے والے زائرین، جن کا تمام عرب کے ہر گوشے سے ہوتا تھا، اسے پڑھتے اور داد وتحسین دیتے تھے۔ بنابریں جزیرہ عرب میں لہجات مختلفہ کے ساتھ ساتھ ایک معیاری ادبی زبان، جسے ابن ورّاق نے linguistic norm کہا ہے، کا وجود اظہر من الشّمس ہے۔ اسی کو مغربی مصنفین ومحققین نے کلاسیکی عربی کہا ہے جو، بقول ان کے، ظہور اسلام سے 100 یا 150 سال قبل سے، جزیرہ میں اسی نکھری شکل میں موجود و مروّج تھی (۳۰)۔ اور یہ زبان عربوں کے اپنی زبان سے لگاؤ کے نتیجے میں مسلسل ارتقا کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ اس امر کی شہادت محض ورثہ اسلامی سے نہیں ملتی بلکہ مغربی محققین کی تحقیقات نے بھی اس پر مہر تصدیق ثبت کی ہے۔ مثلاً G.L. Della Vida (۳۱) لکھتا ہے کہ زمانہ ماقبل اسلام ہی میں عربوں نے غیر معمولی طور پر انتہائی وسیع اور جاذب و باثروت زبان تشکیل دے لی تھی۔ جو خطابت وشاعری امثلہ وحکیم، قصص وشعر کی زبان تھی (۳۲)۔ اسی طرح Bernard Lewis عربوں کے کارہائے نمایاں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> But the basic and significant was their perfection of a literary koine, classical Arabic, the elaboration of a complex meterical system and the composition of a highly artistic poetry, unique in the history of the semities, significant as this artistic outburst is the history of comparative and semitic literature.(33)

چنانچہ تاریخی حقائق کی روشنی میں ثابت ہوا کہ جزیرہ عرب میں ایک معیاری ادبی زبان (lingustic norm) موجود تھی۔

ابن ورّاق نے اس ادبی زبان کے وجود کی نفی کے لیے دلیل پیش کی ہے کہ عرب معاشرے میں نوشت و خواند کے رواج و رجحان کے عنقا ہونے کے سبب اس معاشرے میں کوئی lingustic norm ہو ہی نہیں سکتا (۳۴)۔ یہ دعوٰی بھی مبنی برکذب و باطل ہے کہ جزیرہ عرب میں نوشت وخواند کا بالکل رجحان نہیں تھا یا عرب اس فن سے یکسر انجان و نابلد تھے۔ درحقیقت معتبر تحقیقات کے مطابق عربوں کے ہاں ظہور اسلام سے کم از کم تین سو برس قبل فن تحریر پایا جاتا تھا (۳۵)۔ بقول ناصرالدین اسد عربوں میں از منۂ قدیم سے قبیلہ وار کتب مرتب کرنے

کا رواج چلا آتا ہے جن میں قبیلے کی جنگوں، قابلِ فخر کارناموں، شاعری اور حکمت پاروں کا ذکر ہوتا تھا۔ حکمت آمیز مقولوں، جامع اقوال اور امثال پر مشتمل کتب کا ذکر جس کثرت سے ملتا ہے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا (۳۶)۔ پانچویں چھٹی صدی عیسوی میں یہ فن اپنے عروج پر تھا یعنی بہت سے لوگ نوشت وخواند کی صلاحیت کے حامل تھے۔ اس کے متعدد دلائل پیش کیے جا سکتے ہیں مثلاً:

آثاریات کی قدیم ومعتبر تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ شمالی عربوں کے ہاں فنِ کتابت موجود تھا (۳۷)۔ وہ نبطی خط میں لکھتے تھے جو آرامی خط کی مبدّل شکل تھی اور چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں خط عربی اپنی اصل شکل میں کاملاً وجود پذیر ہو چکا تھا اور مستعمل ومروّج تھا (۳۸)۔ اہل یمن قدیم زمانے سے فن کتابت سے آشنا تھے اور بقول کارل بروکلمان ان کے دینی و قانونی متون نقوش کم از کم ایک ہزار ق م سے ان کے ہاں اس فن کے وجود پر دلالت کرتے ہیں (۳۹)۔ اسی طرح نجد وتہامہ میں بھی ایسے آثار ملتے ہیں۔ ۳۲۸ء کا کتبہ النمارہ خط آرامی میں مکتوبہ ہے، غالباً تجارتی تحریروں میں یہی خط مستعمل ہوگا۔ غالباً حیرہ کے نصرانی شعراء اسی خط میں اپنے شعر لکھتے ہوں گے ابن مقبل کی شاعری سے اسی کی تصدیق ہوتی ہے (۴۰)۔ ظہورِ اسلام کے وقت اور ماقبل کے حوالے سے سامان تحریر کا تذکرہ ملتا ہے مثلاً چمڑا، کپڑا، لکڑی، ہڈی، پتھر، ورق وقرطاس اور کتاب کے آلات مثلاً قلم، دوات، مداد وغیرہ (۴۱)۔ جاہلی شاعری میں کتاب اور تحریر کا ذکر عام ملتا ہے۔ جہاں تک اس موضوع کا تعلق ہے کہ یہ تحریریں کس قسم کی تھیں تو ان میں مذہبی صحیفے بھی تھے چنانچہ ورقہ بن نوفل کے عبرانی زبان میں لکھنے کی روایت ملتی ہے (۴۲)۔ اسی طرح سوید بن صامت کا حضورؐ سے مجلّہ لقمان کا ذکر مروی ہے (۴۳)۔ مزید برآں عہد نامے، حلف نامے، میثاق، تجارتی دستاویزات، ذاتی خطوط سب تحریر ہی کی مختلف قسمیں تھیں۔ اسی طرح قبروں کے کتبات اور انگوٹھیوں کے نقش بھی تحریریں ہی تھیں (۴۴)۔

متعدد مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ عہد جاہلیت میں عرب کے یہود ونصاریٰ کے پاس ان کی مذہبی کتب یا ان کے کچھ اجزا، تحریری صورت میں موجود تھے اور اہل عرب ان کتب سے مستفید ہوا کرتے تھے (۴۵)۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ قراءت سے آشنا تھے تو کتابت سے یکسر نابلد کیسے ہو سکتے تھے؟ فؤاد سیزگین کے مطابق عہد تاریخ العرب و انساب کے حوالے سے زمانہ قدیم میں کتب مرتب ہوئی تھیں۔ عہد جاہلیت میں انساب کی حفاظت کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ افسوس کہ وہ محفوظ نہیں رہ سکیں۔ اب ہم صرف مصادر میں پڑھتے ہیں کہ فلاں فلاں عالم نے عہد جاہلیت کی کتب پڑھیں، یا ان کے پاس وہ کتب تھیں وغیرہ۔ مثلاً وهب بن منبہ (م۱۰۰ھ یا ۱۱۶ء) جن سے تاریخ کعبہ کے متعلق حاصل کی گئی معلومات جو ازرقی نے تاریخ مکہ میں ذکر کیں۔ اسی طرح کچھ کتب کے نام محفوظ ہیں مثلاً اخبار الیمن و اشعارھا وانسابھا اور کتاب المثالب جس کو زیاد بن امیہ م۵۳ھ نے مرتّب کیا (۴۶)۔

نزول قرآن کے وقت صرف قریش میں ۱۷ سے زائد افراد کتابت کے فن سے آشنا تھے۔ انھی میں زیدؓ بن ثابت تھے جو بکثرت وحی کی کتابت کے سبب کاتب وحی کہلائے۔ انھی میں سے عبداللہ بن الارقم تھے جنھیں (بعد میں) آنجنابؐ کی جانب سے مختلف سلاطین و بادشاہوں کے نام خطوط لکھنے کی ذمہ داری سونپی گئی (۴۷)۔ دس سن نبوی میں جب آنجنابؐ اور مسلمان شعب ابی طالب میں محصور تھے تب کفار مکہ نے اتفاق رائے سے بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف ایک دستاویز تحریر کرائی اس پر تین مہریں ثبت کر کے اسے کعبہ کے اندر لٹکا دیا (۴۸)۔ عہد نبویؐ میں کاتبین وحی، آپ کے فرامین مبارک کو لکھنے والے اور کاتبین مکتوبات رسولؐ موجود تھے (۴۹)۔ آپؐ کے حکم پر اہم دستاویزات کو ضبطِ تحریر میں لانے والے موجود تھے۔ آپؐ نے خود بھی اس رجحان یعنی کتابت کے ذریعے علم کو محفوظ کرنے کی ترغیب و حوصلہ افزائی فرمائی۔ آپؐ کا فرمانِ مبارک اکتبوا الابی شاہ (۵۰) اور قیّد وا العلم بالکتاب (۵۱) اسی کی روشن مثالیں ہیں اور اسی کی مثال اسیرانِ غزوہ بدر کے لیے اس فدیے کی تعیین ہے کہ جو کوئی نوشت وخواند سے آشنا ہے وہ دس مسلم بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے۔ اسی طرح بعض خواتین کے فنِ کتابت سے آگاہ ہونے کی روایات بھی ملتی ہیں مثلاً شفا بنت عبداللہ العدویہ (۵۲)، عہد جاہلیت میں لکھنا سیکھ چکی تھیں اور ام المؤمنین حضرت حفصہؓ نے بھی انھی سے لکھنا سیکھا تھا (۵۳)۔ مندرجہ بالا معروضات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ کے عہد مبارک میں فن کتابت عرب میں موجود تھا اور تمام اہم دستاویزات کو ضبط تحریر لانے کی روایت بھی۔ البتہ معجزاتی حد تک قوی حافظے کے حامل عرب معلومات/علم کو محفوظ کرنے کے لیے تحریر کے بجائے یادداشت اور حافظے کے استعمال کو ترجیح دیتے تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ جو قوم شاعری کی انتہائی دلدادہ تھی اس میں اپنی اس من پسند شے یعنی شاعری کو لکھنے کا رواج بالکل عنقا ہوسکتا ہے؟ تاریخ کے صفحات اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں اور ہمیں شاعری کے محفوظ و مکتوب ہونے کی گواہی/ شہادت بھی دیتے ہیں لہٰذا نہ صرف اسلامی بلکہ مغربی مصادر کی روشنی میں ابن ورّاق کا یہ اعتراض کہ چونکہ کتابت موجود نہ تھی اس لیے linguistic norm ہو ہی نہیں سکتا، باطل ثابت ہوتا ہے۔ اس ضمن میں M.C.A. Macdonalds کے درج ذیل الفاظ جو اس نے اپنے مقالے "Ancient North Arabian" میں جزیرہ عرب کے حوالے سے لکھے، بڑے برمحل ہوں گے:

> Literacy seems to have been extraordinarily wide spread, not only among the settled populations but also among the nomads. Indeed the sources of thousand of graffiti on the rocks of the syro-Arabian desert suggest that it must have been almost universal among the latter. By the roman period, it is probable that a higher proportion of the population in this region was functionally literate than in any other

area of the ancient world."(54)

گویا نوشت وخواند سے عرب خوب آگاہ وآشنا تھے۔فصاحت و بلاغت ان کی گھٹی میں تھی۔اپنی زبان کی حفاظت وارتقا کا خوب اہتمام کرتے تھے۔شعر کہنا سننا ان کا محبوب ترین مشغلہ بلکہ شعری غنائیت وموسیقیت ان کا طرّہ امتیاز تھی۔اب ان کے ہاں ایک معیاری ٹکسالی زبان کے تشکیل وترویج کے محرّکات تو بے شمار دکھائی دیتے ہیں مانع کوئی بھی نظر نہیں آتا۔اسے مغربی محققین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عربوں کے ہاں ظہور اسلام سے قبل ایک اعلیٰ معیاری زبان موجود تھی۔اسی میں قرآن کریم کے نزول نے اسے فصاحت کا ایک معیار و میزان قرار دیا(۵۵)۔ بعینہٖ آج تمام عربی گوممالک میں باوصف بُعد زِمان ومکان کے ایک مشترکہ ادبی زبان موجود ہے۔اسی حوالے سے Hittie لکھتا ہے ایک عراقی کسی مراکشی کی گفتگو کو شاید نہیں سمجھ پائے گا لیکن اس کی تحریر کوضرور سمجھ لے گا(۵۶)۔

مفسرین کے مطابق یہ فصیح و بلیغ ترین لہجہ جو بطور مشترکہ ادبی زبان کے جزیرہ عرب میں رائج و مستعمل تھا۔ قریش کا لہجہ تھا۔ابن ورّاق نے مسلم محققین کے اس دعوے پر دو اعتراضات اٹھائے ہیں۔ذیل میں بالترتیب ان کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

۱- قریش کا سارے عرب قبائل سے ملنا جلنا تھا۔مزید برآں تجارت کے سلسلے میں غیرعربوں سے بھی ان کے روابط رہتے تھے۔ان کا لہجہ فصیح تر کیسے رہ سکتا تھا(۵۷)۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جو وجوہات ابن ورّاق کو قریش کے حوالے سے تشکیک میں مبتلا کررہی ہیں وہی اس لہجے کے افصح واعذب لہجے میں ڈھل جانے کا سبب بنیں۔گذشتہ صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے کہ عرب اپنی زبان کے نکھار وارتقا، اس کی توسیع کے لیے خاص اہتمام کیا کرتے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ اس امر کا التزام بھی کرتے تھے کہ ان کی زبان فصاحت کے ایک خاص معیار پر قائم رہے۔قریش کومختلف ثقافتی اجتماعات میں تمام قبائل عرب سے اختلاط کا موقع ملتا۔حج وعمرہ کے لیے اکنافِ عرب سے لوگ مکہ میں جمع ہوتے تھے۔عرب کے تمام بڑے اہم بازار مکہ مکرمہ کے قرب و جوار میں لگا کرتے۔تجارتی سفروں میں بھی ان کو دوسرے قبائل اور بسااوقات دوسرے ممالک کے لوگوں سے اختلاط و امتزاج کا موقعہ ملتا۔نتیجتاً قریش عمدہ ترین الفاظ اور تراکیب اپنے لہجے میں شامل کرتے رہتے تھے(۵۸)۔اس طرح وہ غیرملکی تجّار سے روابط کے نتیجے میں برآمدہ مصنوعات کے اسماء کے ساتھ ساتھ اور بہت سے الفاظ اخذ کر لیتے ان کو عربی قوامیس میں ڈھال کر اپنے لہجے کا ایک حصہ بنا لیتے(۵۹)۔

۲- قریش کو بیت اللہ کا متولی ہونے کے سبب سارے عرب میں سردار قبیلہ تصور کیا جاتا تھا۔اسی طرح ان کا لہجہ، جس پر عرب کے ماہرین لغت اہل بدو نے کوئی اعتراضات وارد نہیں کیے، بھی تمام لہجوں سے افضل و اعلیٰ تصور کیا جاتا تھا۔ایسی کوئی روایت نہیں ملتی کہ ان کی فصاحت پر کسی نے انگشت نمائی کی ہو(۶۰)۔

۳- جغرافیائی اعتبار سے قریش کا مسکن ایسا مقام تھا جو غیر عربی ریاستوں سے کافی فاصلے پر واقع تھا۔ بدیں سبب قریش کی زبان غیر محتاط اور کھلے خلط ملط سے محفوظ و مامون اور خالص رہی (۶۱)۔

۴- قریش کی زبان قبائلی لہجات کے معائب سے مبرّا تھی مثلاً فحفحہ، تلتلہ وغیرہ۔ ابوالعباس ثعلب مجالس ثعلب میں لکھتے ہیں قریش کا لہجہ تمیم کے عنعنہ سے، ربیعہ کے کشکشہ سے، قریش کے تضجع سے، ضبہ کے عجرفہ اور بہراء کے تلتلہ سے پاک تھی البتہ ان کے خصائص لہجۂ قریش میں شامل تھے (۶۲)۔

یہی وجہ ہے کہ مختلف میلوں/ اجتماعات میں جہاں کسی شاعر کی شاعری کو جانچنے پرکھنے کا مرحلہ درپیش ہوتا وہاں سیادت وسرداری کی ذمہ داری اور حَکَم کا مقام قبیلۂ قریش کو ملتا تھا۔ اور ان کے فیصلے کو بلا چون و چرا تسلیم بھی کیا جاتا تھا (۶۳)۔

۲: بقول ورّاق: حضور اپنی دانست میں سارے عرب کو مخاطب کر رہے تھے۔ اگر وہ صرف قریشی کے لہجے میں کلام کرتے تو سارے عربوں تک اپنا پیغام کیسے پہنچا سکتے تھے (۶۴)۔

ابن ورّاق کے اس اعتراض کا کافی و شافی اور مفصّل جواب گذشتہ صفحات میں موجود ہے۔ قریش کا لہجہ وہی ہے جو لغت مشترکہ ہونے کے سبب سارے عرب میں سنا سمجھا جاتا تھا لہٰذا اس سے آپؐ کے پیغام کے ابلاغ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی تھی۔ ابن ورّاق نے اس اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ حضورؐ صرف اہل عرب کو نہیں بلکہ تمام انسانیت تک اپنا پیغام پہنچانے پہ مأمور تھے اسی لیے ہمیں یاایھاالناس کے الفاظ ملتے ہیں۔

ہمیں ایسی ایک بھی مثال نہیں ملتی کہ کسی نے کہا ہو کہ ہمیں یہ قرآن سمجھ نہیں آتا (۶۵)۔ البتہ حج، عمرہ یا کسی بھی ایسے موقع پر جب بیرون مکہ سے لوگ آئے ہوئے ہوتے تھے تو اہل مکہ/ قریش شوروغوغا کر کے یہ کوشش کرتے کہ باہر سے آنے والے قرآن کو سننے نہ پائیں مبادا وہ اسلام قبول نہ کرلیں اس کے شواہد قرآن کریم میں بھی موجود ہیں۔ اگر یہ کسی نا قابل فہم زبان میں ہوتا تو اطرافِ عرب کے لوگ اسے سمجھنے پر قادر نہ ہوتے۔

(ج) قواعد وضوابطِ فصحیٰ کی تدوین:

ابن ورّاق کا دعوٰی ہے کہ تدوین لغت کے لیے علمائے لغت اور اہل بدو کے مابین ربط و اتصال تیسری صدی ہجری میں شروع ہوا اس سے قبل ایسا کوئی ربط وعلاقہ نہیں تھا (۶۶)۔

عرب عہد جاہلیت سے ہی اپنی زبان کی حفاظت کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ نزول قرآن کے بعد اس حزم و احتیاط میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ بسااوقات ایسا ہوتا تھا کہ لہجاتی تفاوت کے سبب مختلف قبائل کے لوگ ایک دوسرے کی بات سمجھ نہیں پاتے تھے۔ نزولِ قرآن کے بعد جب بھی قرآن کریم کے کسی لفظ کی تفہیم میں مسئلہ ہوتا تو لوگ آنجنابؐ اور

صحابہؓ کرام کے بعد اپنے عہد کے ماہرین لسانیات یعنی افصح اور عربی پر عبور رکھنے والے لوگوں کی جانب رجوع کرتے تھے۔ چنانچہ اہل بدو میں جو لوگ ماہر عربی دان اور فصیح اللسان تصور کیے جاتے تھے ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ یوں عہد نبویؐ، عہد خلافت راشدہ اور ان کے بعد کے کچھ عرصے تک فہمِ لغت کی ضرورت علماے زبان سے پوری کرلی جاتی تھی۔حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ شعر عربوں کا دیوان ہے جب قرآن کے کسی لفظ کا مفہوم ہمیں معلوم نہ ہوتا تھا تو ہم اشعار کی طرف رجوع کرتے۔ جب قرآن کی کوئی بات سمجھ نہ آئے تو شعر عربی سے رجوع کریں کیونکہ وہ دیوان عرب ہے(۶۷)۔ چنانچہ ہمیں یہ روایات ملتی ہیں کہ نافع بن الازرق اور نجدہ بن عویمر نے حضرت ابن عباس سے چند تفسیری مسائل اس شرط کے ساتھ دریافت کیے کہ ہر کلمے کا مفہوم عربی اشعار کی مدد سے واضح کیا جائے۔تو انہوں نے اسی طرح سے عربی اشعار سے استشہاد کرتے ہوئے ان مسائل کے جواب دیے(۶۸)۔حضرت ابن عباسؓ کو عربی زبان کے حوالے سے سند تصور کیا جاتا تھا۔ اسی طرح بعض دیگر صحابہ بھی لغت میں مہارت تامہ کے حامل تھے۔ لہٰذا لوگوں کو قرآن فہمی میں کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی نیز ان کی زبان ابھی تک خالص تھی اس پر عجمی اثرات نہیں پڑے تھے۔

اسلامی فتوحات کا دائرہ اکناف و اطرافِ ارضی تک وسیع ہوا اور عجمی اقوام حلقہ بگوش اسلام ہونے لگیں تو عربی و عجمی کے وسیع پیمانے پر اختلاط سے عربی زبان بگڑنے لگی۔ بطور خاص شہری زبان بہت زیادہ متاثر ہوئی اور استناد و اعتماد کے قابل نہ رہی تو عربی کے محافظ علما اس امر پر مجبور ہوگئے کہ دیہی علاقوں میں جا کر خالص فصیح عربی زبان سیکھیں(۶۹) جو ہنوز ہر طرح کے اختلاط سے پاک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری صدی ہجری میں کثیر تعداد میں علماے لغت اہل بدو سے تعلیم عربی کے لیے رجوع کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس صف میں بڑے ممتاز علما کے نام ملتے ہیں مثلاً: خلیل بن احمد م۱۷۰ یا ۱۷۸ھ، خلف الاحمر م۱۸۰ھ، یونس بن حبیب الضبی م۱۸۲ھ، الکسائی م۱۸۹ھ، النضر بن شمیل م۲۰۴ھ، الاصمعی م۲۱۵ھ، ابوزید الانصاری م۲۱۵ھ، ابن درید م۳۲۱ھ، الازھری م۳۷۰ھ، الجوہری م۳۹۵ھ یوں پہلی عربی لغت دوسری صدی ہجری میں خلیل بن احمد نے مرتب کی۔ علماے لغت کے بادیہ نشینوں کے ساتھ روابط و اتصال نے تدوین لغت اور پھر لغت نویسی کی اساس قائم کی اور اس کے قواعد وضوابط اور کلمات صحیحہ کو اصلی مصادر و مآخذ سے اخذ کرکے جمع کیا اور سختی سے محفوظ کیا تاکہ عربی زبان کی پاکیزگی اور اس کی اصل مجروح نہ ہو۔ ان کے پیش رووٗں نے اس قیمتی لغوی ورثے کو حرزِ جان بنا کر سنبھالا اور محفوظ کیا۔ یہ لوگ زبان کے متعلق اس قدر حساس تھے کہ جس کلمے یا محاورے کو غلط تصور کرتے خواہ وہ بجائے خود فصیح ہی کیوں نہ ہو اس کے استعمال کو ناجائز قرار دیتے۔ غیر فصیح الفاظ پر نقد و جرح کے سلسلے میں علما نے بہت سی کتب و رسائل بھی مرتب کیے مثلاً: الکسائی م۱۹۲ھ، ابوعبیدہ م۲۰۹ھ، ابوعثمان بن بکر بن محمد المازنی م ۲۴۸ھ، ابو حاتم السلقانی م۲۵۵ھ، ابو حنیفہ الدینوری

م۲۹۰ھ؛ ابوبکر محمد بن الحسن الزبیدی م۳۲۹ھ سبھی علما نے لحن العامہ کے موضوع پر کتب مرتب کیں۔ تاکہ فصحیٰ اور عامیہ کے خلط ملط ہونے کا کوئی خدشہ باقی نہ رہے۔

ان معروضات کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ضبط و تدوینِ قواعد کا عمل تیسری نہیں بلکہ دوسری صدی ہجری میں شروع ہوا۔ اس سے قبل یہ فن موجود تھا لیکن عربوں کی روایت کے مطابق بیش تر مبنی بر حفظ تھا۔ اس امر کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ تدوین و ضبط قواعد میں بھی حدیث کی مانند سند کے بغیر کوئی روایت قبول نہیں کی جاتی تھی۔ نیز اہم ترین بات یہ تھی کہ دوسری صدی ہجری میں قواعد لغت مدّون ہوئے وضع نہیں۔ یہ قواعد پہلے سے جزیرہ عرب میں موجود تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سوال اٹھتا ہے کہ اہل عرب کے ہاں اشعار (یا نثر پاروں) کے حسن و قبح کو پرکھنے کا کیا معیار تھا اور وہ کس بنا پر کسی شعر/قصیدے کو سند قبولیت عطا کرتے اور کسی کو مردود قرار دے دیتے تھے؟

چھٹی صدی عیسوی میں ایک معیاری ادبی عربی زبان کے وجود کی تردید و ابطال کے لیے ابن ورّاق نے الزام تراش لیا کہ ساری جاہلی شاعری تیسری صدی ہجری کے بعد ایک دیدہ دانستہ منصوبے کے تحت وضع کی گئی اور ظاہر یہ کیا گیا کہ یہ عہد جاہلی کی شاعری ہے۔ تاکہ جزیرہ عرب میں نزول قرآن کے وقت کسی فصحیٰ / معیاری ادبی زبان کے وجود کے اثبات میں کوئی شبہ نہ کیا جا سکے۔ ابن ورّاق کے مطابق جاہلی شاعری بھی افسانہ ہے جس کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں ہے(۷۰)۔

فی الواقعہ عربوں کے ہاں شاعری کی جو قدر و منزلت تھی اس کے پیشِ نظر یہ گمان بھی بالکل غلط ہوگا کہ انہوں نے اسے محررہ صورت میں محفوظ نہ رکھا ہوگا۔ اگرچہ کتابت ان کے ہاں مستحسن نہ تھی تاہم بالکل مفقود وعنقا بھی نہ تھی۔ اس حوالے سے متعدد مثالیں مصادر میں موجود ہیں۔ ان سب کا احاطہ ناصرالدین اسد نے مصادر الشعر الجاہلی میں بڑی جامعیت سے کیا ہے مثلاً:

آغاز اسلام کے زمانے میں کعب بن زہیر اور بجیر بن زہیر کے مابین منظوم مراسلت (۷۱)

قسیبہ کا ابوالطحان کے کجاوے پر چھری سے کچھ اشعار لکھ لینا (۷۲)

ناصرالدین کے پیش کردہ مواد کے مطابق آغاز اسلام اور عہد بنی امیّہ میں سامان خواند و نوشت سستے داموں دستیاب ہونے لگا تھا اور ہر آدمی کی رسائی میں تھا(۷۳) اور پہلی صدی ہجری کے نصف تک پہنچتے پہنچتے باقاعدہ کتب خانوں کا سراغ ملنے لگتا ہے(۷۴)۔

ان تاریخی حقائق کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کرنا کہ عربوں کے عمل تدوین تیسری صدی ہجری میں شروع ہوا، بالکل غیر محققانہ اور غیر ذمہ دارانہ رویّے کا مظہر ہے۔

دراصل عربوں کے ہاں بہت ابتدائی زمانے میں ہی تفسیر، حدیث، لغت، انساب وشاعری وغیرہ کی تدوین کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ ابوعمرو العلاء (م ۱۵۴ھ) اور حماد الراویہ (م ۱۵۵ھ) جیسے رواۃ محض حافظے کی بنا پر نہیں بلکہ مدوّنہ شعری مجموعوں کی بنا پر شاعری کی روایت کیا کرتے تھے (۷۵)۔ ان مدوّنات میں سے بعض کا زمانہ حضرت عمرؓ کے دور تک ثابت ہوتا ہے (۷۶)۔ اموی دور میں شاعری کو قدیم مدوّنات سے نقل کیا گیا (۷۷)۔ ناصر الدین اسد نے اس روایت کو بھی درست تسلیم کیا ہے کہ نعمان بن المنذر نے اپنے لیے اشعار کے دفتر لکھوائے تھے اور پھر انھیں اپنے محل میں دفن کرادیا تھا۔ اموی دور میں مختار الثقفی نے یہ سن کر کہ یہاں خزانہ دفن ہے اس مقام کو کھدوایا تو یہ اشعار برآمد ہوئے (۷۸)۔

بقول ناصر الدین، معلّقات حماد الراویہ کے زمانے سے پہلے ہی تحریری شکل میں موجود تھے (۷۹)۔ نیز ابوتمام نے حماسہ سمیت شاعری کے پانچ مجموعے پرانے مدوّنات ہی سے انتخاب کیے (۸۰)۔ ناصر الدین اسد نے ٹھوس دلائل سے ثابت کیا ہے کہ روایت شعر میں پایا جانے والا لفظی اختلاف بعض حالات میں تحریری اساس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ مثلاً ایک ہی شعر کی ایک روایت میں ''شیخ'' اور دوسری میں ''سیخ'' کا لفظ۔ اسی طرح ''اُحزم'' اور ''اُخزم''، ''تامَر'' اور تامِر'' جیسی اختلافی قراءتیں جو غلط خوانی کے سوا کسی سبب سے ہو ہی نہیں سکتیں (۸۱)۔

پس ثابت ہوتا ہے کہ روایت کے وقت تحریر بھی عموماً سامنے ہوتی تھی اور اس حقیقت کا اعتراف مغربی محققین بھی کرتے ہیں مثلاً Watt قدیم جاہلی شاعری کو عربوں کے حوالے سے جملہ معلومات کے حصول کے لیے مصدر قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ بعض مغربی محققین جاہلی شاعری کو بالکل بے اصل قرار دیتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ علماء ومحققین کی اکثریت نے اس رائے کو رد کر دیا ہے اور اس میں چند الحاقات کو تسلیم کرتے ہوئے بہ حیثیت مجموعی جاہلی شاعری کے وجود کو درست تسلیم کیا ہے۔ جسے نسل در نسل بہت ایمان داری سے روایت کیا گیا ہے (۸۲)۔ اہم ترین نکتہ Watt کا یہ بیان ہے کہ ''جاہلی شاعری سے حاصل ہونے والی بہت سی معلومات کی تصدیق ایک طرف تو قرآن پاک سے ہوتی ہے اور دوسری طرف جدید ماہرینِ ارضیات کی تحقیقات کے نتیجے میں سامنے آنے والے کتبات کے مطالعے سے'' (۸۳)۔ Carl Brockelmann کے مطابق جاہلی شاعری کی جمع و تدوین کا باقاعدہ آغاز اموی دور میں ہو گیا تھا اور عباسی عہد میں اس کی تکمیل ہو گئی تھی (۸۴)۔

ابن ورّاق نے مارگولیتھ اور طٰہٰ حسین کا حوالہ دیا ہے جن کی تردید خود مغربی علما بھی کر چکے ہیں۔ مستشرقین کی ایک معقول تعداد جاہلی شاعری پر اعتماد کرتی ہے۔ بقول ڈاکٹر خورشید رضوی چارلس جیمز لائل اس گروہ کا نقیب کہلا سکتا ہے جس کا میلان جاہلی شاعری پر اعتماد کی طرف تھا (۸۵) چنانچہ وہ لکھتے ہیں: قبل از اسلام کے شعری ذخیرے

میں جعلی والحاقی کلام کا وجود مسلّم ہے تاہم اسی ذخیرے میں حقیقی جاہلی شاعری کے نمونے بھی محفوظ ہیں۔ علاوہ ازیں ماہر راویوں کی جعل سازی بھی بعض اوقات اس کمال کی ہے کہ اس میں اصل کے خط و خال دیکھے جاسکتے ہیں(۸۶)۔

ابن ورّاق نے جاہلی شاعری کے من گھڑت ہونے پر ایک دلیل یہ دی کہ تیسری صدی ہجری تک کی تفاسیر میں شاعری سے استشہاد نہیں کیا گیا۔ اگر اس وقت تک اس کا کوئی وجود ہوتا تو لازماً مفسرین اس سے استشہاد کرتے (۸۷)۔

یہ دعویٰ بالکل غلط اور مبنی بر کذب ہے۔ ایک محقق کا تحریری صورت میں موجود تاریخی حقائق کی یوں تکذیب کر دینا انتہائی تعجّب خیز ہے۔ فی الحقیقت تیسری صدی ہجری تک مرتب ہونے والی تفاسیر میں اشعار ملتے ہیں۔ ان سے استشہاد ملتا ہے۔ مثلاً امام محدث عبدالرزاق بن ھمّام الصنعانی (م۲۱۱) کی تفسیر عبدالرزاق میں سورۃ کہف (فی عین حمئۃ)(۸۸) کے ذیل میں اشعار موجود ہیں۔ البتہ انہوں نے اشعار سے محض ایک جگہ استشہاد کیا کیونکہ ان کا زیادہ رجحان احادیث وآثار کی روشنی میں تفسیر کی جانب تھا اس لیے انھوں نے اشعار کو بہت زیادہ درخور اعتنانہ جانا(۸۹)۔

علاوہ ازیں ابوجعفر طبری (م۳۱۰) کی تفسیر کی مثال لی جاسکتی ہے اس میں جاہلی کے اشعار بکثرت ملتے ہیں۔ مثلاً الم کے ذیل انھوں نے اشعار سے استشہاد کیا ہے۔ نیز بہت سے مقامات پر لبید بن ربیعہ، کعب بن زہیر، نابغہ وغیرھم کے اشعار کے حوالے پائے جاتے ہیں(۹۰)۔

حصہ دوم: **قرآن کریم صرف لہجہ قریش پر نہیں بلکہ مختلف لہجات اس میں پائے جاتے ہیں:**

ابن ورّاق کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں یہ دعوٰی پایا جاتا ہے کہ قرآن لغت قریش پر نازل ہوا(۹۱)۔

قرآن کریم میں اس امر کی صراحت بالکل نہیں ہے کہ وہ کسی خاص لہجے پر اترا یا نہیں۔ اس میں بس قرآن کے عربی میں نازل ہونے کا تذکرہ ہے۔ قدما کے ہاں عموماً یہ رائے پائی جاتی ہے کہ قرآن لغۃ قریش یعنی قریش کے لہجے کے مطابق نازل ہوا۔ اس تاثر کے وجود پذیر ہونے کی وجوہات ذیل میں پیش کی جارہی ہیں:

۱- آنجنابؐ نے فرمایا ''میں افصح العرب ہوں میں فصیح ترین قبیلے قریش میں پیدا ہوا اور اسی طرح کے قبیلے سعد بن بکر میں پرورش پائی(۹۲)۔

۲- روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابن مسعود کو پیغام بھیجا کہ قرآن لغت قریش پر اترا ہے لہٰذا وہ اس لہجے کے مطابق ہی قرآن پڑھائیں ھذیل کے لہجے پر نہیں(۹۳)۔

۳- حضرت عثمان غنیؓ نے جمع المصاحف کے لیے قائم کردہ کمیٹی میں تمام قریشی حضرات رکھے اور ان کو حکم دیا

کہ جہاں کہیں کتابت میں اختلاف رائے ہو وہاں لغتِ قریش پر لکھیں کیونکہ قرآن ان کی لغت پر اترا(۹۴)۔ پھر اس کمیٹی کے مابین تابوت لکھنے پر اختلاف رائے ہوا تو حکم دیا گیا کہ اسے قریش کے لغت کے مطابق ''ت'' کے ساتھ لکھیں اور ایسا ہی کیا گیا(۹۵)۔

۴- حضرت ابن مسعودؓ کے حوالے سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قبیلہ مضر کے کاتبین کو ترجیح دیتے تھے(۹۶)۔

یہ روایات درست ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ تأثر کہ قرآن محض لغتِ قریش پر اترا، درست نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں احادیثِ مبارکہ سے رہنمائی ملتی ہے۔ آپ ؐ کا فرمان مبارک ہے۔

ان هٰذا القرآن انزل علی سبعة احرف فاقرؤا ما تیسر منه (۹۷)

یہ قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے۔ پس اس میں جو کچھ تمہارے لیے آسان ہو اس طریقے سے پڑھ لو۔

اسی طرح آپ ؐ کا فرمان ہے:

مجھے جبریلؑ نے قرآن کریم ایک حرف پر پڑھایا تو میں نے مراجعت کی اور میں رعایت طلب کرتا رہا اور وہ (قرآن کریم کے حروف میں) اضافہ کرتے رہے یہاں تک کہ وہ سات حرفوں تک پہنچ گئے(۹۸)۔

علماء کے ہاں حدیث میں مذکور ''حرف'' کے معنی عموماً لہجات کے لیے گئے ہیں۔ بعض علما کے مطابق سات حروف سے مراد قریش، ھذیل، تمیم، ازد، ربیعہ، ھوازن، سعد بن بکر کے لہجات ہیں(۹۹)۔ بعض کے مطابق پانچ عجز ھوازن سے ہیں اور ایک رائے کے مطابق کعب بن لوی اور کعب بن عمرو بن خزاعہ بھی ان میں شامل ہیں(۱۰۰)۔ جبکہ ایک رائے کے مطابق سات کا عدد عرب محاورے کے مطابق کثرت کے اظہار کے لیے ہے۔ اس سے مراد متعیّن عدد نہیں۔ لہٰذا قرآن کریم میں عرب کی تمام فصیح لغات (لہجات) کی نمائندگی موجود ہے(۱۰۱)۔ قرآن کریم کے دیگر پہلوؤں پر کام کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی قرون اولیٰ علما کی توجہ کا مرکز ومحور رہی۔ انہوں نے اس میں وارد مختلف قبائل کے لہجات کی نشان دہی کی۔ چنانچہ مصادر میں لغات القبائل پر مشتمل مرتبہ کتب کے تذکرے ملتے ہیں۔ مثلاً ابن ندیم نے ایسی کتب و رسائل کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق الفراء، ابوزید، الاصمعی، الھیثم بن عدی، محمد بن یحییٰ القطعی، ابن درید وغیرہ نے اس موضوع پر مشتمل کتب مرتب کیں(۱۰۲)۔ ابن حسنون کی اللغات فی القرآن اور ابوعبید القاسم بن سلام کی ماورد فی القرآن من القبائل دستیاب ہیں۔ تاہم بیشتر کتب دست برد زمانہ سے محفوظ و مامون نہ رہ سکیں۔ اب موجود و میسر کتب میں اولین اور بہترین معلومات کا مآخذ حضرت ابن عباسؓ کی

جانب منسوب کتاب اللغات فی القرآن(۱۰۳) ہے اس کتاب کے مطابق قرآن کریم میں قریش کے لہجے سے ۱۰۴، هذیل سے ۳۶، کنانہ سے ۲۳، جرھم سے ۲۱، بنوتمیم سے۱۳، قیس سے ۶، عمان، ازدشنوءۃ وخثعم سے ۵، مذحج مدین وغسان سے۴، بنوحنیفہ حضرموت اور اشعر سے ۳، انمار سے ۲، سبایمامہ اور مزینہ وثقیف سے ا، خزرج سے ا، عمالقۃ سعدالعشیر ۃ اور سدوس سے ا لفظ قرآن کریم میں شامل ہوا(۱۰۴)۔

اسی طرح ایک فہرست امام سیوطیؒ کی کتاب الاتقان میں ملتی ہے۔ اس کے مطابق کنانہ سے ۳۶، هذیل سے ۵۷، حمیر سے ۴۲، جرھم سے ۱۰، ازدشنوءہ سے ۱۷، مذحج سے ۱۴، خثعم سے ۱۰، قیس سے ۱۶، سعدالعشیر ۃ سے ۴، کندہ سے ۶، عذرہ سے ۲، حضرموت سے ۸، غسان سے ۷، مزینہ سے ۲، لخم سے ۴، جذام سے ۵، بنی حنیفہ سے ۶، یمامہ سے ۲، سلیم سے ۲، سبا سے ۷، عمارہ سے ۷، طئی سے ۹، عمان سے ۷، خزاعۃ سے ۴، تمیم سے ۴، انمار سے ۴، اشعر سے ۷، اوس سے ۲، خزرج سے ۲ الفاظ قرآن کریم میں پائے جاتے ہیں(۱۰۵)۔

تیسری فہرست معجم لغات القبائل والامصار سے ملتی ہے۔ اس کے مطابق قیس سے ۱۴، بنی عبس سے ا، ہذیل سے ۴۸، کنانہ سے ۳۰، جرھم سے ۲۵، غسّان سے ۴، سدوس سے ا، کندہ سے ۵، ازدشنوءۃ سے ۱۰، تمیم سے ۱۱، عمان سے ۴، یمامہ سے ا، عمالقہ سے ا، عذرہ سے ۳، مذحج سے ۴، حضرموت سے ۳، طی سے ۳، خثعم سے ۸، ہمدان سے ۴، لخم سے ۲، انمار سے ۳، خزرج سے ۲، بربر سے ا، عک سے ا، سعدالعشیر ۃ سے ا، ہوازن سے ۲، ازد و اوس سے ا لفظ قرآن کریم میں ملتے ہیں(۱۰۶) علوم القرآن کی مختلف کتب اور تفاسیر میں بھی قرآن کریم میں پائے جانے والے لہجات مختلفہ کا تذکرہ ملتا ہے۔

ذیل میں قرآن کریم میں وارد لہجاتِ مختلفہ کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

اشتراک لفظی وتضاد معنی:

قدیم لہجات عربیہ کے تخصّصات میں سے ایک اشتراک لفظی اور تضادِ معنی تھا(۱۰۷)۔ ایک ہی لفظ مختلف قبائل میں مختلف مفاہیم کے لیے مستعمل ہوتا تھا۔ مثلاً ذئب کے معنی عموماً بھیڑیئے کے لیے جاتے ہیں لیکن اسی لفظ کو هذیلی شیر کے لیے استعمال کرتے تھے(۱۰۸)۔ قرآن کریم میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں مثلاً:

مولیٰ: اس لفظ کے معنی آزاد کردہ غلام کے بھی ہیں اور غلام کو آزاد کرنے والے کو بھی مولی کہا جاتا ہے(۱۰۹)۔

اظہار وادغام کا اختلاف:

الفاظ میں حروف کے اظہار و ادغام بھی لہجاتی تفاوت میں سے ہے۔ قریش کے لہجے میں اظہار پایا جاتا ہے۔ یعنی یَرْتَدِدْ نہ کہ یَرْتدّ، وَاحْلُلْ نہ کہ وَاحُلَّ چنانچہ قرآن کریم میں بیش تر مقامات پر ہمیں اظہار کی مثالیں ملتی

ہیں: مثلاً

مَنْ یَرْتَدِدْ منکم(۱۱۰)؛ و الیُمْلِلْ (۱۱۱)، یُحْبِبْکُمُ(۱۱۲)، یُشَاقِق (۱۱۳)

اس کے برعکس ادغام، جو کہ تمیمی لہجے کا خاصّہ ہے(۱۱۴)، کی مثالیں بھی قرآن کریم میں پائی جاتی ہیں مثلاً:

وَمَنْ یُشَاقِّ اللّٰه(۱۱۵)۔

أسماء الافعال میں اختلاف:

اسماء الافعال میں بھی مختلف قبائل کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔مثلاً هَیْهَات: اسماء الافعال میں سے ہے جس کے معنی ہیں وہ ایک مردود ہوا (بَعُدَ)۔ یہ لفظ تمیمی لہجے کے مطابق هَیْهَاتَ ہے اور حجازی لہجے میں یہ اَیْهَاتَ ہے(۱۱۶)۔قرآن کریم میں ہمیں تمیمی لہجے کے مطابق یعنی هَیْهَات ملتا ہے۔(۱۱۷)

حروف کی اعرابی حالتوں کا اختلاف:

اعرابی حالتوں کے مطابقت سے الفاظ میں حروف کا تغیّر وتبدّل بھی لہجاتی اختلافات میں سے ایک ہے۔ مثلاً بلحارث بن کعب کا تخصّص تھا کہ اَلف کو اصلی حالت پر برقرار رکھتے ہیں اعراب کے اعتبار سے اس میں تبدیلی نہیں لاتے مثلاً عَلَیْهَا کی جگہ وہ عَلاهَا بولتے ہیں(۱۱۸)۔قرآن کریم میں اس لہجے کی نمائندگی بھی ملتی ہے۔

... اِنْ هٰذانِ لساحران(۱۱۹)۔

ترادف:

عربی زبان میں وسعت، گہرائی وگیرائی کی حامل ہے۔اس میں ایک ہی مفہوم کی ادائی کے لیے بہت سے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یہ تعدّد الفاظ کسی نہ کسی لسانی گروہ کی نمائندگی کرتا ہے(۱۲۰)۔قرآن کریم میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں مثلاً:

...تَارةً اُخرىٰ(۱۲۱) بمعنی دوسری بار(قریشی لہجہ کے مطابق مَرّةً اُخریٰ)(۱۲۲)

غِسلین(۱۲۳) بمعنی دوزخیوں کے جسموں سے نکلنے والی پیپ، ازدشنوءۃ کا لہجہ ہے(۱۲۴)

مفرطون(۱۲۵) ھذیل کا لہجہ ہے(۱۲۶)

اِنفضّوا(۱۲۷) خزرجی لہجہ کی مثال ہے(۱۲۸)

سامدون(۱۲۹) تمیمی لہجے کے مطابق آیا ہے(۱۳۰)۔

حذف واثبات حروف کا اختلاف:

الفاظ میں حروف کے حذف یا اثبات کے حوالے سے بھی قبائل عرب میں اختلاف پایا جاتا تھا۔مثلاً یَأتی

میں کے اثبات کے ساتھ بولنا، لا ادریِ میں ی کو حذف کر کے ادرِ اور ربیِّ میں ي کو حذف کر کے رَبِّ بولنا
قرآن کریم میں دونوں ہی مثالیں ملتی ہیں۔

مثلاً يَوْمَ تَأتي السماء...(۱۳۱)

اسی طرح

ربِّ ابن لِي عندك بيتاً في الجنة....(۱۳۲)

ربَّ لا تذرني فردًا وانت....(۱۳۳)

ھمزہ کی ادائی وعدم ادائی

تحقیق وعدم تحقیق ھمزہ بھی لہجاتی اختلافات میں سے ایک ہے۔بعض قبائل ھمزہ کو باہتمام ادا کرتے تھے اور بعض کے ہاں اس کے برعکس صورتحال تھی۔ چنانچہ قریشی لہجہ میں ھمزہ کی ادائی کا اہتمام نہ تھا۔ یہ تمیم کا تخصص ہے(۱۳۴)۔مثلاً ان کے ہاں سَلْ (پوچھ) مستعمل ہے جب کہ تمیمی سے اس کو اُسأل (پوچھ) کہتے ہیں(۱۳۵)۔ قرآن کریم میں دونوں کی نمائندگی ملتی ہے۔

ایسی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔طوالت سے اجتناب کے لیے انہی پر اکتفا کیا جارہا ہے۔ بقول داؤد سلوم قرآن کریم میں سے۵۰۰ سے زائد مقامات پر قریش کے لہجے سے ہٹ کر دیگر لہجات عرب کی نمائندگی ملتی ہے۔ کتب تفسیر میں بھی اس حوالے سے مواد ملتا ہے۔علوم القرآن کی کتب میں بھی اس موضوع پر ابواب مختص کیے گئے ہیں اور لغات القبائل کے عنوان سے مستقل کتب بھی مرتب کی گئی ہیں۔ ان معروضات کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان قطعاً یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ قرآن محض لغتِ قریش پر اترا۔ البتہ اس کا غالب حصہ لغتِ قریش کے مطابق ہی ہے اور اس کی وجوہات صفحاتِ گذشتہ میں بشرح وبسط پیش کردی گئی ہیں۔ چنانچہ ابن ورّاق کا یہ کہنا کہ مسلمان قرآن کے لغت قریش پر ہونے پر مدعی ہیں کذب بیانی سے زیادہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

خلاصۂ کلام:

گذشتہ صفحات میں ابن ورّاق کے دعاوی کا جائزہ معتبر مصادر کی روشنی میں لیا گیا ہے۔ چونکہ ابن ورّاق کے نزدیک اسلامی ورثہ علمی تحقیقی اصولوں کے مطابق بے لاگ انداز میں مرتّب نہیں کیا گیا اور آنکھوں پر عقیدت کی پٹی چڑھا کر لکھی جانے کے سبب قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ بنابریں مقالہ ھٰذا میں حتّی الامکان مغربی مصنفین کی کتب کے حوالے دیے گئے ہیں۔ انہی کتب کی روشنی میں بلاخوفِ بطلان وتردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابن ورّاق کا تحقیقی کام بجز تخمینی قیاسات کے کچھ نہیں ہے۔ اس حوالے سے اس کے دلائل سرتاسر باطل، بے اصل و بے بنیاد اور تحقیق کے

مسلّمہ اصولوں کے خلاف ہیں۔

مسلّمہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ ظہور اسلام سے ۱۰۰ یا ۱۵۰ برس قبل جزیرہ عرب میں ایک شستہ، گُتھی ہوئی، مربوط ادبی زبان وجود پذیر ہوچکی تھی۔ یہ شعر و شاعری خطابت و امثلہ، وصایا و حِکَم اور مفاخرۃ کی زبان تھی جو سارے قبائل عرب کے لہجات کے محاسن وتخصّصات کی جامع اور ان کے معائب سے مبرّا ومنزّہ تھی۔ نیز اس میں معرّب الفاظ بھی شامل تھے۔ بیت اللہ کے سبب مکہ مکرمہ کو اور اس کی تولیت وضیوف الرحمٰن کی خدمت کی سعادت قریش کو حاصل ہونے کے سبب قریش کو سارے عرب میں سیادت حاصل تھی۔ نیز حج وعمرہ، تجارتی سرگرمیوں اور اسواق العرب کا مرکز ہونے کے سبب مکہ مکرمہ میں سارے عرب کے لوگ آتے اور بیرونی تجار سے اختلاط کا موقع بھی میسر آتا۔ اس کثیراللہجات اختلاط و امتزاج کے نتیجے میں فطری طور پر مشترکہ ادبی لہجہ ہونے کی سعادت قریشی لہجے کے حصے میں آئی۔ جسے سارے عرب میں مشترکہ طور پر تسلیم کیا جاتا تھا اور جس پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ قرآن کریم بھی اسی معجز و بے مثال ادبی زبان میں نازل ہوا جس میں فصیح ترین لہجات عربیہ کی نمائندگی موجود ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(1) Ibn Warraq (ed.) What the Koran really says, Prometheus Book, USA, 2002, p:32

(2) "Diglossia" in New Oxford Dictionary of English, ed. by Judi Pearsal, Oxford University Press, 2001.

(3) "Diglossia" in the New Encyclopedia Brittanica, Chicago, 15th. ed. 2005.

(4) David crystal: An Encyclopedia Dictionary of Language and Languages, USA, 1988

(5) Luigi Paret: Unesco History of Mankind, tr. from Italian by Guy E. F: Chilver and Sylvia Chilver, London 1965.

(6) Ibn Warraq (ed): What the Koran really says, p:36

(۷) ’’سنسکرت‘‘ در اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہِ پنجاب لاہور۔

(8) A. Yusuf Ali, The Making of India, A.N.C. Black Ltd. London, 1925, p: 16; "Sankrit" in International Encyclopedia of Linguistics, Oxford University Press, New York, 1992.

(9) Witold Rodzinski: A History of China, Pergamon Press Oxford 1979, p:13

(10) "Coptic" in Encyclopedia Brittanica

(11) "Arabs" in Encyclopedia Americana

(12) P.K. Hittie, Islam a Way of Life, University of Minnesota 1970.

(13) Carl Brocklman, History of Islamic People, London, 1964, p:305-306

(14) P.K. Hittie, History of the Arabs, n.p., n.d., p:55.

(۱۵) مدح سرائی نثری صنف جس میں اپنی، اپنے قبیلہ، خاندان، اپنے حسب ونسب کی تعریف وتوصیف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے تھے، دیکھیے:

"Mufakhara" in Encyclopedia of Arabic Literature, Routledge London n.d.; Ignaz Goldziher, A Short History of Classical Arabic Literature, tr. by Joseph Desomogyle, p:7

(۱٦) ذکی مبارک: النثر الفنی فی القرآن ،طبع الرابع، س ن۔ م ن، ج:۱،ص: ۴۳، جورج غریب: لمحات فی الادب العربی، دارالثقافة بیروت، الطبعہ الثالثہ ۱۹۷۸ء،ص: ۳۹-۴۰؛ عُمر فروخ: المنہاج فی الادب العربی، بیروت ۱۹٦۴ء، ص ۱۴،ص:۳؛ عبدالعلیم، اعجاز القرآنی، علی گڑھ؛ ۱۹۳٦ء، العرب فی الجاهلية و صدرالاسلام، لجنۃ الفنّ،ص: ۳۰۵-۳۰۹؛ الموجز فی الادب،ص:۳۹-۴۰

(۱۸) حنّا الفاخوری: الجامع فی تاریخ الادب العربی، دار ذوی القربیٰ، طبع اول، ۱۴۲۲ھ،ص: ۱۲٦، جرجی زیدان: تاریخ اللغة العربية، مطبعہ الھلال مصر، ۱۹۰۴ء، ج:۱،ص: ۳۵؛ شوقی ضیف: الفن و مذاہبہ، دارالمعارف مصر، س ن،ص: ۲۷-۲۳؛

(17) Victor Panner, The Islamic Tradition, USA 1980, p:42;

(19) "Fables" in Encyclopedia of Arabic Literature; محمد حسن درویش: تاریخ الادب العربی،ص ۴۱

(۲۰) حنا الفاخوری: الجامع،ص:۸۴

(۲۱) الموجز فی الادب العربی، ج:۱،ص:۳۴-۳۹

(22) M.A. Filthtinsky, Arabic Literature, n.d., p:10-11;

کارلونا لینو: تاریخ الادب العربیۃ، محاضرات، دارالمعارف مصر، ۱۹۵۴ء،ص:٦۳

(23) Arnold Hottinger, The Arabs, London, n.d., p:19; عبدالعلیم: اعجاز القرآن،ص:۲-۵

(24) Peter Mansfield, The Arabs, p:17; احسان عباس: دراسات فی الادب العربی، س ن،ص:۱۳۸

(۲۵) عرب کے مختلف میلے اور بازار مثلاً دومتہ الجندل کا میلہ ہجر، عمان، حضرت موت، عدن اور صقار کے میلے، عکاظ، ذوالجنہ وغیرہ تفصیل کے لیے دیکھیے: سعید الافغانی: اسواق العرب،

(۲٦) نخلہ اور طائف کے درمیان مکہ سے تین منزل کی دوری پر واقع ایک گاؤں جہاں عرب کا ایک بڑا مرکزی بازار لگتا

تھا۔

(۲۷) مکہ مکرمہ کے قریب ہی واقع ایک بستی مجنہ میں لگنے والا بازار۔

(۲۸) میدان عرفات سے کچھ فاصلے پر واقع بستی میں ذوالمجاز میں لگنے والا بازار

(۲۹) عمر فروّخ، المنهاج فی الادب العربی و تاریخه، دارالعلم للملایین بیروت، س ن، ص: ۱۳-۱۴؛ "Arab Civilization" in Encyclopedia؛ اگرچہ بعض علما تعلیق قصائد کو درست تسلیم نہیں کرتے اور اس دعوے کی تائید وتوثیق میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس قسم کی روایت صرف ابن رشیق نے پیش کی۔لیکن معتبر مصادر میں ہمیں تعلیق علی الکعبہ کے شواہد ملتے ہیں مثلاً مقاطعۂ قریش کی دستاویز کا لٹکایا جانا؛ نیز یہ روایت بھی ملتی ہے کہ سورۃ الکوثر کو لکھوا کر دیوار کعبہ پر آویزاں کیا گیا جسے پڑھ کر ولید بن مغیرہ، معروف عرب شاعر نے ماھذا القول البشر کا تبصرہ کیا۔اس پر مستزاد عرب میں شاعری اور عمدہ قصیدے کی اہمیت کے پیش نظر ان معروف قصائد کی تعلیق علی الکعبہ کی روایت بعید از امکان نہیں ہے۔

(30) "Arab Civilization" in Encyclopedia Americana, Grolier incorparated, U.S.A., 1986, نیز دیکھیے "Ancient North Arabian" in the Cambridge Encyclopedia of World's Ancient Languages.

-31 Giorgio Levi Della Vida (1886-1967) یہودی اطالوی مستشرق۔

(32) "Arabic Literature" in Collier's Encyclopedia, Macmillan Educational co. 1982.

(33) Bernard Lewis (ed), The Cambridge History of Islam, Cambridge University Press, 1970

(34) Ibn Warraq, What the Koran really Says, p:37

(۳۵) ناصرالدین اسد، مصادر الشعر الجاهلی، ص: ۳۷

(۳۶) ایضاً، ص ۶۵-۷۰

(37) "Arabic Script" in Encyclopedia Brittanica, 1974; "Arabic Language and Literature" in Funk and Wagnalls Encyclopedia, USA MCMLXXI; "Arabic Literature" in Collier's Encyclopedia, New York 1979.; An Encyclopedic Dictionary of Language and Literature by David Crystal, Cambridge University, Press, New York etc, 1991.

(۳۸) عبدالعلیم سابع: الخط العربی، م ن، س ن، ۱۹۴۱، ص: ۷

(۳۹) کارل بروکلمان، تاریخ الادب العربی، ت: د.عبدالعلیم النجّار، ج: ۱، ص: ۶۳

(۴۰) ناصرالدین اسد، مصادر الشعر الجاهلی، ص: ۳۸

(۴۱) مثلاً دیکھیے: احمد بن فارس بن زکریا، الصاحبی فی فقه اللغة، محمد علی بیضوت، ۱۹۹۷ء، ص: ۱۶

(۴۲) الاغانی، دارالکتب العلمیہ، س ن، ج: ۳، ص: ۱۲۵

(۴۳) بحوالہ ناصرالدین اسد، مصادر الشعر الجاهلی، ص:۵۹

(۴۴) مثلاً دیکھیے: زمانہ ماقبل حروب مجّر میں عثمان بن الحویرث کا بادشاہ شام سے عرب قبائل کی جانب اپنی تملیک کا خط لکھوانا، ابوجعفر البغدادی محمد بن حبیب، المنمق فی اخبار قریش، عالم الکتب بیروت، طبع اول ۱۹۸۵ء، ص: ۱۵۴؛ ناصرالدین اسد، مصادر الشعر الجاهلی، ص: ۶۵-۷۰؛

(45) Charles Cultur Torrey: The Jewish Foundation of Islam

(۴۶) فؤاد سیزگین: تاریخ التراث العربی، ت محمود فہمی حجازی، دارالثقافة والنشر، سعودیہ، س ن، ج: ۱، ص: ۲۷-۲۸

(۴۷) عبدالعلیم السابع: الخط العربی، ص: ۷

(۴۸) ابن سعد محمد بن منیع، الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت، ج: ۱ص: ۱۷۸

(۴۹) مثلاً دیکھیے ابن حجر احمد بن علی بن حجر السقلانی، فتح الباری شرح صحیح البخاری، دارالمعرفة بیروت، ۱۳۹۷ھ، ج: ۹، ص: ۲۲

(۵۰) بخاری، جامع الصحیح، کتاب العلم، ح: ۱۱۲

(۵۱) حاکم ابوعبداللہ محمد: المستدرك علی الصححین، دارالکتب العلمیہ بیروت، ۱۹۹۹ء، حدیث: ۳۵۹

(۵۲) صحابیہ رسول جو عہد جاہلیت میں کتابت کے فن سے آشنا تھیں

(۵۳) ناصرالدین اسد، مصادرالشعر الجاهلی، ص: ۶۱

(54) "Ancient North Arabian" in the Cambridge Encyclopedia of Ancient Languages, Cambridge University Press, 1978.

(55) Hittie, "Arabic Language" in Encyclopedia Americana

(56) Ibid.

(57) Ibn Warraq, What the Koran really say, New York, 1998, p:32

(۵۸) شوقی ضیف: الفن و مذاهبه فی نثر العربی، ص: ۵۸

(۵۹) قنوجی صدیق حسن خان، البلغه فی اصول اللغة، ص: ۹۳

(60) Ahmed Ali Imam, Variant readings of the Qur'an, p:109-110

(۶۱) احمد رضا العاملی: مولد اللغة، دارالمکتبة الحیاة، ۱۹۶۵ء، ص: ۱-۶۰؛ ابن خلدون محمد بن عبدالرحمٰن: مقدمة کتاب العبر و دیوان المبتداء والخبر فی ایام العرب والبربرومن عاهدهم من ذوی السلطان الاکبر، داراحیا التراث العربی، س ن، ج: ۱، ص: ۶۳۵

(۶۲) ابوالعباس ثعلب احمد بن یحیٰ: مجالس ثعلب، دارالمعارف قاہرہ، س ن، ج: ۱، ص: ۱۸

(63) Ahmad Ali Imam, Varient Readings of the Qur'an, USA, 1998, p:121

(64) Ibn Warraq, What the Koran Really Says, p:33

(65) Muhammad Akram Chauhdary: "Orientalism on Variant readings of Fatiha: The

Case of Arthur Jeffery" in American Journal of Social Sciences, 1995 No. v: , p:176

(66) Ibn Warraq, What the Koran Really Says, p:36

(۶۷) طبری ابوجعفر محمد بن جریر، جامع البیان عن تأویل آی القرآن، بمواضع کثیرہ

(۶۸) حضرت ابن عباس سے نافع بن الازرق کا سوال کرنا اوران کا استشھاد از شعر عرب۔

(۶۹) ''علم اللغۃ'' دراردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانش گاہِ پنجاب، لاہور

(70) Ibn Warraq, What the Koran Really Says, p: 36

اپنے مؤقف کی تائید وتصدیق کے لیے ورّاق نے مارگولیتھ اور طہٰ حسین کے جاہلی شاعری پر اعتراضات کا اعادہ کیا ہے اور انھی کا سہارا لیتے ہوئے سارے جاہلی عہد کے ورثے کو مردود کردیا ہے۔

(۷۱) ابوزید القرشی، جمہرۃ أشعار العرب، ص:۲۴

(۷۲) ناصرالدین اسد، مصادر الشعر الجاھلی، ص:۹۸، ۱۳۱

(۷۳) ناصرالدین، مصادر، ص: ۱۳۵

(۷۴) ایضاً، ۱۴۱

(۷۵) ایضاً، ص۱۵۵

(۷۶) ایضاً، ص:۱۵۶-۱۵۷

(۷۷) ایضاً، ص۱۵۸

(۷۸) ایضاً، ص۱۶۱

(۷۹) ایضاً، ص:۱۸۰

(۸۰) ایضاً، ص:۱۷۵

(۸۱) خورشید رضوی، عربی ادب قبل از اسلام، ج:۱، ص:۲۸۰

(82) "Badw" in Encyclopedia of Islam, Lieden, E.J. Brill.

(83) Ibid.

(84) "Arabic Language" in Encyclopedia of Islam

(۸۵) خورشید رضوی، عربی ادب قبل از اسلام، ج:۱، ص:۲۸۰

(۸۶) ایضاً، ص: ۲۸۸

(87) Ibn Warraq, What the Koran really says, p:38

(۸۸) الصنعانی عبدالرزاق بن ھمّام، تفسیر عبدالرزاق، تحقیق محمود محمد عبدہ، دارالکتب العلمیہ، بیروت، الطبعہ الاولیٰ، ۱۹۹۹ء، ج:۲، ص: ۳۴۵

(۸۹) ایضاً، ج:۱ص:۱۲۴

(۹۰) طبری ابوجعفر محمد بن جریر، جامع البیان عن تاویل آی القرآن، دارالکتب العلمیہ، بیرون، الطبعہ الثالثہ، ۱۹۹۹ء، ج:۱،ص:۱۷۱

(91) Ibn Warraq, What the Koran really says, P:37

(۹۲) ابوعبیدہ، فضائل القرآن،س ن،مقدمہ

(۹۳) عسقلانی، فتح الباری، ج:۹،ص:۳۰۹

(۹۴) بخاری ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل: الجامع الصحیح، مشمولہ موسوعہ الحدیث الشریف الکتب السنۃ، دارالسلام ریاض: ۲۰۰۲،، جامع، ح:۴۹۹۲

(۹۵) عسقلانی، فتح الباری، ج۹ص:۲۰

(۹۶) ابوعبید، فضائل القرآن،ص:۳۱۰

(۹۷) بخاری ابوعبداللہ محمد بن اسمٰعیل: الجامع الصحیح، مشمولہ موسوعہ الحدیث الشریف الکتب السنۃ، دارالسلام ریاض: ۲۰۰۲، حدیث:۴۹۹۲

(۹۸) ایضاً۔

(۹۹) الزرکشی بدرالدین محمد بن عبداللہ: البرهان فی علوم القرآن، دارالفکر بیروت الطبعۃ الاولیٰ، ۱۹۸۸، ج:۱۱ ص: ۲۷۶؛ محمد جوادعلی، لهجة القرآن الکریم'' درمجلّہ العلمی العراقی، ج:۳، جزو:۲، ۱۹۸۹ء،ص:۲۷۵

(۱۰۰) الجزری شمس الدین ابی الخیر محمد: النشر فی القراء ت العشر، مکتبہ التجاریہ مصر، ۱۹۹۸ء، ج:۱،ص:۱۲؛

(۱۰۱) ابوشامۃ عبدالرحمٰن بن اسمٰعیل المقدسی: المرشد الو جیز الی علوم تتعلق بالکتاب العزیز،ص: ۹۳؛الرافعی مصطفیٰ صادق، اعجاز القرآن والبلاغة النبوية،ص: ۶۵

(۱۰۲) ابن ندیم محمد اسحٰق، ،الفهرست، دارالمعرفۃ بیروت،س ن۔

(۱۰۳) یہ کتاب بتحقیق وتصحیح صلاح الدین مُنَجِّد شائع ہوئی۔

(۱۰۴) ابن حسنون المقری (اسنادہ عن ابن عباس)، کتاب اللغات فی القرآن،ص:۱۷-۵۴

(۱۰۵) سیوطی جلال الدین بن ابی بکر عبدالرحمٰن، الاتقان فی علوم القرآن، عیسیٰ البابی الحلبی مصر،س ن، ج:۱،ص:۱۱۳

(۱۰۶) جمیل سعید وداؤدسلوم، معجم لغات القبائل والامصار، دوجلدوں میں مفصل بحث موجود ہے۔

(۱۰۷) ابن فارس: الصاحبی فی فقه اللغة،ص:۲۶؛ قنوجی صدیق حسن خان، البلغة فی اصول اللغة، جامعہ تکرین رسالہ جامعہ،س ن،ص۱۱۹

(۱۰۸) ابراہیم انیس: فی اللهجات العربية،ص:۴۷

(۱۰۹) مثلاً دیکھیے: ابن منظور، لسان العرب، بذیل 'ول ی''

(۱۱۰) البقرة:۲۱۷

(۱۱۱) البقرۃ:۲۸۲

(۱۱۲) آل عمران:۳۱،

(۱۱۳) النساء:۱۱۵

(۱۱۴) ابراہیم انیس،فی اللھجات العربیۃ،ص:۴۷

(۱۱۵) ۶:۵۹

(۱۱۶) سیوطی:المزھر فی علوم اللغۃ وانواعھا،۷۰: ج:۲،ص: ۲۷۵

(۱۱۷) المومنون:۳۶

(۱۱۸) داؤدسلوم، فی اللھجات العربیۃ القدیمہ،ص:۲۶؛ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ابن فارس:الصاحبی فی فقہ اللغۃ،ص:۲۵-۲۶۔

(۱۱۹) طٰہٰ:۶۳

(۱۲۰) ابن جنّی عثمان بن ابی الفتح، الخصائص ،طبع دوم،۱۹۵۲ء، ج:۱،ص: ۳۷۵

(۱۲۱) طٰہٰ: ۵۵

(۱۲۲) ابن حسنون، کتاب اللغات،ص: ۳۵

(۱۲۳) الحاقۃ:۳۶

(۱۲۴) داؤدسلوم وسعید جمیل، معجم لغات القبائل، ۲۱۸

(۱۲۵) النحل:۶۲

(۱۲۶) داؤدسلوم،سعید جمیل، معجم لغات القبائل،۱:۲۲۷

(۱۲۷) غافر:۲۱

(۱۲۸) ابن حسنون، کتاب اللغات فی القرآن الکریم،ص:۴۱

(۱۲۹) الطّور:۶

(۱۳۰) ابن حسنون، کتاب اللغات فی القرآن الکریم،ص:۴۴

(۱۳۱) الدخان: ۱۰

(۱۳۲) التحریم:۱۱

(۱۳۳) الانبیاء:۸۹

(۱۳۴) مثلاً دیکھیے: البغدادی عبدالقادر بن عمر،خزانۃ الادب و لب اللباب لسان العرب، ج:۱،ص:۵۷۹

(۱۳۵) ایضاً۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆